© rasailojaraid.com

فکر و نظر---- اسلام آباد جلد:۳۹ شمارہ:۲

مسائل فقہیہ میں سلاطینِ دہلی کی دلچسپی

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ☆

اسلام ایک جامع نظام حیات سے عبارت ہے اس کے اصول و ضوابط انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہیں۔ مذہبی و سیاسی، معاشرتی و معاشی، انفرادی و اجتماعی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس سے متعلق شریعتِ اسلامی میں رہنمائی نہ ملتی ہو۔ غرض کہ انسانی زندگی کے تمام شعبے شریعت کے قوانین سے مرتبط و منضبط ہیں۔ انہی قوانین کو ان کے تفصیلی دلائل کے ساتھ جاننے سمجھنے و مطالعہ کرنے کا نام فقہ ہے۔ علم فقہ کی داغ بیل اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور ہی میں پڑ چکی تھی۔ اس کی نشوونما اور ترقی دوسری اور تیسری صدی ہجری کی مرہون منت ہے۔ اسی دور میں فقہ کے معروف مذاہب وجود میں آئے، فقہاء، مجتہدین کے توسط سے فقہ اسلامی کی تدوین کا اہم کام انجام پایا اور مختلف مذاہب کے مطابق فقہ کی امہاتِ کتب مرتب ہوئیں۔ مزید براں مقامی فقہاء کے رجحانات کے اعتبار سے مختلف علاقوں میں مختلف مذاہب فقہ کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ مثلاً حجاز و یمن میں فقہ شافعی و مالکی، نجد میں فقہ حنبلی، اندلس اور شمالی افریقہ کے مغربی حصہ میں فقہ مالکی اور وسط ایشیا کے بیشتر ممالک عراق، ماوراء النہر، آذر بائیجان، افغانستان وغیرہ میں فقہ حنفی کو رواج ملا۔[1]

تیرہویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا میں منگولوں کی یورش نہ صرف سیاسی تباہ کاری کا باعث بنی بلکہ علمی و ثقافتی زندگی کے لیے بھی بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلم حکومت سلاطین دہلی کی قیادت میں اپنے قدم جما رہی تھی اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک نیا مرکز تعمیر کر رہی تھی۔ سلاطین کی علم دوستی و معارف پروری اور فیاضی و فراخدلی کے باعث دہلی مختلف علوم و فنون کے ماہرین کا ایک عظیم مرکز بن گیا،

☆ ریڈر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالخصوص وسط ایشیا کے شورش زدہ علاقہ کے اہل علم و فن کے لیے بہترین مرجع و ماویٰ ثابت ہوا۔(۲) اس زمانہ میں مرکزی ایشیا کے مختلف حصوں سے کثیر تعداد میں علماء و فضلاء وارد ہند ہوئے ان میں اکثریت فقہاء کی تھی۔ یہاں سکونت اختیار کرنے کے بعد فقہی علوم ہی ان کی توجہ کا خاص مرکز بنے۔ ان کی سرگرمیوں کے نتیجہ میں علمی حلقوں میں فقہ کا رنگ ایسا غالب ہوا کہ فقہ و اصول فقہ کا حصول معیار فضیلت قرار پایا۔ مزید براں حکومت کے متعدد مناصب (قاضی، محتسب، مفتی وغیرہ) ایسے تھے جن پر تقرری کے لیے فقہ میں مہارت ضروری تھی، اس وجہ سے بھی اس علم کے حصول میں دلچسپی پائی جاتی تھی۔ خود سلاطین وقت نے بھی اس کی ترویج و اشاعت پر خصوصی توجہ دی تاکہ فقہ کے ماہرین کی کمی نہ رہے اور حکومت کی انتظامی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ ان سب کے علاوہ فقہ سے سلاطین دہلی کی مناسبت کی ایک خاص وجہ غزنی و غور کا علمی ماحول تھا جن سے یہ سلاطین اور ان کے رفقاء حکومت اصلاً تعلق رکھتے تھے۔ دہلی میں ان کے دربار سے جو علماء منسلک ہوئے یا مقربین بارگاہ بنے ان میں فقہاء زیادہ تھے۔ علماء کا جو طبقہ انتظامیہ سے منسلک تھا اور اس حیثیت سے سلاطین سے باقاعدہ ربط ضبط رکھتا تھا وہ بھی فقہاء کے زمرہ سے تھا۔ ان سب عوامل نے مل کر تیرہویں و چودہویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں فقہ کا بازار گرم کیا یہاں تک کہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، بحث و مباحثہ مختلف ذرائع سے فقہ اسلامی کو فروغ حاصل ہوا۔

زیر بحث موضوع کے اعتبار سے یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کہ سلاطینِ دہلی فقہی مسائل کو سمجھنے میں کافی دلچسپی رکھتے تھے اور سیاست و حکومت سے متعلق اہم معاملات اور معاشرت و معیشت کے باب میں پیش آمدہ نئے مسائل میں شریعت کا موقف جاننے کے خواہش مند رہتے تھے۔ تاریخی مآخذ میں مختلف سلاطین کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ حضر و سفر میں علماء کی صحبت پسند کرتے تھے اور ان سے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال بھی کرتے رہتے تھے۔ مثلاً سلطان محمد بن تغلق (۱۳۲۵-۱۳۵۱ء) کے بارے میں صبح الاعشیٰ کے مصنف القلقشندی نے یہ ذکر کیا ہے کہ روزانہ اس کے دسترخوان پر دو سو فقیہ موجود رہتے تھے، جن سے وہ دوران طعام تبادلہ خیال بھی کرتا رہتا تھا۔(۳) اسی طرح سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) کی بابت معاصر مورخ رزق اللہ مشتاقی نے یہ شہادت پیش کی ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روزانہ رات میں کھانے کے وقت علماء سے فقہی مسائل پر مذاکرہ سلطان کا معمول تھا۔[۴] مختلف مسائل پر سلاطین و علماء کے مابین تبادلہ خیال اور مذاکرات کی تفصیلات تاریخی کتب میں ملتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا بیان یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قاضی مغیث الدین بیانوی سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کے ممتاز علماء میں سے تھے۔ ایک روز سلطان نے انہیں بلایا اور کہا کہ وہ ان سے کچھ مسائل دریافت کرنا چاہتے ہیں لیکن جواب دیتے وقت وہ سچ بات کہیں گے اور دریافت طلب امور سے متعلق جو کچھ شریعت کا موقف ہو اسے بلا خوف و خطر بیان کریں گے، سلطان نے جو مسائل دریافت کیے تھے وہ یہ ہیں:

۱۔ ہندوؤں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کس طرح کے ہندوؤں کو خراج گزار کہیں گے۔

۲۔ شریعت کی رو سے چور، بددیانت و رشوت خور افسران حکومت کی سزا کیا ہے؟

۳۔ ایام شہزادگی میں دیوگیر کی فتح کے دوران انہیں جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا وہ ان کا اپنا حق ہے یا بیت المال کا حصہ ہے؟

۴۔ بیت المال میں اس کا اور اس کے اہل و عیال کا کس قدر حق ہے۔[۵]

قاضی مغیث نے ان تمام سوالات کے جوابات فقہی نقطہ نظر سے بہت تفصیل سے دیے۔ سلطان نے بعض جوابات پر اعتراض کیے اور مزید پوچھ گچھ کی لیکن قاضی نے آخر میں یہی جواب دیا کہ آپ نے شرعی مسلہ دریافت کیا تھا۔ میں نے اسے صاف صاف بیان کر دیا۔ قاضی صاحب کے جوابات کی نوعیت سمجھنے کے لیے ان کے ایک جواب کو یہاں نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں شریعت میں کسی متعین سزا کا ذکر نہیں ملتا البتہ بعض کتابوں میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اگر عمال یا افسران مالیات کو بقدر کفایت تنخواہ نہ ملے اور وہ بیت المال سے کچھ چرا لیں یا رشوت ستانی میں ملوث ہوں یا حکومت کے آمدنی میں خرد برد کریں تو حاکم وقت کو اختیار ہے کہ وہ مصلحت کے مطابق انہیں سزا دے خواہ ان کا مال ضبط کرے یا انہیں قید میں ڈال دے۔ مذکورہ صورت میں ان پر سرقہ کی حد (قطع ید) جاری کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس پر سلطان نے یہ تبصرہ فرمایا کہ اس نے یہ حکم دے رکھا ہے کہ مصرفوں (آمد و خرچ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حساب کتاب کے ذمہ داروں) اور دوسرے عہدہ داروں کو اس قدر تنخواہ دی جائے کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ گزر بسر کرسکیں لیکن اس کے باوجود اگر کوئی چوری یا خیانت کا مرتکب ہو تو اس سے رقم مسروقہ یا مغصوبہ واپس لے لی جائے خواہ اس کے لیے اسے سزا کیوں نہ دینی پڑے۔(۶) سلطان محمد بن تغلق اپنی سخت روی کے لیے بہت مشہور تھے۔ وہ مخالفوں و باغیوں کو سخت سے سخت سزائیں دینے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ انہوں نے معاصر مورخ ضیاء الدین برنی (جو عالم بھی تھے) سے سزاؤں کے بارے میں طویل گفتگو کی۔ خاص طور سے یہ جاننا چاہا کہ قدیم دور کے بادشاہ کس کس جرم میں سزائے موت دیا کرتے تھے اور ان میں شریعت کی رو سے کون سی جائز ہیں اور کون سی ناجائز۔ ضیاء الدین برنی نے اس ضمن میں ایران کے قدیم بادشاہوں کا طرزِ عمل بیان کرنے کے بعد یہ واضح کیا کہ حدیث شریف کی رو سے صرف تین جرم میں سزائے موت دینا جائز ہوگا۔ (۱) مرتد ہونا، (۲) کسی مسلم کو قتل کرنا، (۳) کسی شادی شدہ کا زنا کا ارتکاب کرنا۔ ان کے علاوہ بعض دیگر جرائم (بادشاہ کے ساتھ بے وفائی و غداری۔ اس کے دشمنوں و مخالفوں کی مدد، اس کی کھلی ہوئی نافرمانی وغیرہ) جن کی وجہ سے قدیم بادشاہ سزائے موت دیتے تھے ان کا معاملہ سلطنت کے مفاد میں حکمران کی صوابدید پر منحصر ہے۔ اگرچہ جواب کا آخری حصہ خود محل نظر ہے لیکن سلطان اس سے بھی مطمئن نہیں تھے اور انہوں نے مکالمہ کے آخر میں یہ فرمایا کہ میرے زمانہ میں حالات بدل چکے ہیں۔ بغاوت و سرکشی کے واقعات بڑھ گئے ہیں۔ مخالفوں و دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اس لیے ملک میں نظم و ضبط قائم رکھنے اور سلطنت کے استحکام کے لیے بغاوت و سرکشی کے ادنیٰ واقعات اور غداری و بے وفائی کی معمولی مثالوں پر بھی میں سزائے موت دینے سے نہیں چوکتا۔(۷) دوسری جانب اسی سلطان کے بارے میں بعض مآخذ میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس نے دربار میں چار مفتی مامور کر رکھے تھے اور ان کی رائے معلوم کیے بغیر کسی کو سزائے موت نہیں دیتے تھے۔(۸)

مختلف مسائل میں علماء سے سلاطین کے استفسار اور شریعت کا نقطۂ نظر جاننے میں ان کی دلچسپی کی اور بہت سی مثالیں مآخذ میں دستیاب ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی یہاں گنجائش نہیں۔ لیکن اس ضمن میں یہ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علماء سے انفرادی طور پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استفسار کے علاوہ اہم و مختلف فیہ مسائل میں علماء کی مجموعی رائے جاننے کے لیے سلاطین علمی مذاکرے اور بحث و مباحثہ کی مجلسیں منعقد کراتے تھے جنہیں اس وقت کی اصطلاح میں محضر کہا جاتا تھا اس میں مختلف علاقوں بالخصوص دہلی کے ممتاز علماء کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی اور اگر کوئی ایسا مسئلہ ہوتا جس کا تعلق صوفیاء سے بھی ہوتا تو مشائخ کو بھی مدعو کیا جاتا۔ ان میں سے کسی ایک بزرگ یا معروف عالم کو حکم یا صدر مجلس کے طور پر مقرر کیا جاتا۔ اس زمانہ میں سماع (آلات موسیقی کے ساتھ صوفیانہ کلام کی مجالس کا انعقاد اور ان سے لطف اندوز ہونا) کا مسئلہ بہت مختلف فیہ رہا ہے۔ چشتی صوفیاء کے یہاں یہ معمول تھا جبکہ علماء اس پر اعتراض کرتے تھے۔ سلطان التمش (۱۲۱۰-۱۲۳۵ء) کے عہد میں سماع کی شرعی حیثیت پر غور و فکر کے لیے محضر طلب کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں علماء و مشائخ شریک ہوئے۔[9] اسی سلطان کے زمانہ میں شیخ جلال الدین تبریزی پر ایک رکیک الزام کی تحقیق اور فیصلہ کے لیے محضر بلایا گیا تھا۔[10] تیسری بار سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں (۱۲۹۰-۱۲۹۵ء) میں سیدی مولا کے خلاف بغاوت کے الزام پر بحث و مباحثہ اور اس کی سزا کی تعیین کے لیے محضر کا اہتمام کیا گیا۔[11] سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰-۱۳۲۵ء) کے دور میں علماء و صوفیا کے مابین سماع کا مسئلہ پھر موضوع بحث بنا۔ شیخ نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں یہ معمول تھا۔ اس کے لیے شیخ اس وقت علماء کے حلقہ میں ہدف تنقید بن رہے تھے۔ اس کی شرعی حیثیت سمجھنے کے لیے سلطان نے محضر منعقد کیا اور اس میں دہلی کے تمام معروف علماء و مشائخ کو مدعو کیا۔ دونوں حلقوں کی جانب سے اس مسئلہ پر کھل کر اظہارِ خیال کیا گیا۔ گرچہ اس محضر کے نتائج کے بارے میں اختلاف ہے لیکن ایک روایت کے مطابق سماع کو ''اہل حال'' کے لیے جائز قرار دیا گیا۔[12] سلطان فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱-۱۳۸۸ء) دینی رجحان اور شریعت کی پاسداری کے لیے زیادہ مشہور تھے، اہم مسائل میں فیصلہ لینے سے قبل علماء کی اجتماعی رائے معلوم کرنے میں سلطان نے کافی دلچسپی لی۔ خاص محضر کے نام سے سلطان نے اس وقت علماء کی میٹنگ بلائی جب بعض امراء نے ایک لڑکے کو محمد بن تغلق کا بیٹا مشہور کر کے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا تھا، اس مسئلہ پر غور و فکر کے بعد علماء نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ سلطان کی تخت نشینی شرعی طور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر درست ہے۔[۱۳] اس کے علاوہ مورخین کے بیانات سے یہ شہادت ملتی ہے کہ اہم مسائل میں علماء سے صلاح و مشورہ کرنا سلطان کا معمول رہا ہے۔ خاص طور سے معاشرت و معیشت اور حکومت سے متعلق نئے مسائل میں فیصلہ لینے سے قبل وہ علماء کی رائے ضرور معلوم کرتے تھے۔ چند اہم امور جن کے بارے میں فیصلہ سے قبل سلطان نے علماء سے استفسار کیا درج ذیل ہیں:

۱۔ سابق سلاطین کے زمانہ سے حکومت عوام سے مختلف قسم کے جو محاصل وصول کرتی ہے ان میں کون سے شرعی ہیں اور کون سے غیر شرعی؟[۱۴]

۲۔ کیا شریعت کی رو سے برہمن جزیہ سے مستثنیٰ قرار دیے جانے کے مستحق ہیں؟[۱۵]

۳۔ کیا حکومت کو اپنے اخراجات کی تکمیل کے لیے شریعت کے متعینہ محاصل کے علاوہ مزید محاصل عاید کرنے کا اختیار حاصل ہے؟[۱۶]

۴۔ ایسے نام نہاد صوفیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے جن کے اعتقادات و اعمال سے گمرہی پھیلتی ہے؟[۱۷]

۵۔ اس زنار دار (برہمن) کو کیا سزا دی جائے جس نے دہلی میں کفر و شرک کی کھلے عام تبلیغ کا اڈہ قائم کر رکھا ہے اور جس کے دامِ تزویر میں آ کر ایک مسلم عورت مرتد ہو گئی ہے؟[۱۸]

۶۔ اس شخص کے خلاف کیا اقدام کیا جائے جو مدعی نبوت ہے اور اپنے آپ کو مہدی آخر الزماں کہتا ہے؟[۱۹]

۷۔ اباحتی فرقہ کے لوگوں کو کیا سزا دی جائے جو اپنے قول و عمل سے ایسے طرز زندگی کی دعوت دیتے ہیں جس میں نہ تو شریعت کا پاس و لحاظ ہے اور نہ اخلاقی قدروں کی رو رعایت؟[۲۰]

اس کے علاوہ سلطان فیروز شاہ نے نظم محاصل، سماجی زندگی اور جرم و سزا سے متعلق بہت سے قوانین شرعی اصول و ضوابط کی روشنی میں جاری کیے تھے اور قرین قیاس یہی ہے کہ ان کے اجراء کے وقت بھی سلطان نے علماء سے مشورہ کیا ہوگا۔

دہلی سلاطین میں سلطان سکندر لودھی (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) بھی علماء کی مصاحبت اور ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مشورہ طلبی کے لیے معروف ہے۔ اس کے عہد میں دو بار محضر منعقد کیے جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ پہلی دفعہ ایام شہزادگی میں اور دوسری دفعہ سلطان بننے کے بعد اس نے محضر طلب کیا تھا جس میں ارتداد کا ایک مسئلہ زیر بحث آیا تھا۔[۲۱] پہلا محضر ایک بڑے اہم مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا مختصر بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ شہزادگی کے دوران سکندر لودھی نے کروکشیتر کے ایک قدیم کنڈ کو تباہ کرنا چاہا تو پہلے اس پر شرعی نقطۂ نظر سے غور و فکر کے لیے محضر کے نام سے علماء کی مجلس منعقد کی۔ اس مجلس میں ملک العلماء میاں عبداللہ جوڈہنی بھی شریک تھے۔ علماء نے چاہا کہ وہی اظہار خیال کریں۔ شہزادہ ان سے مخاطب ہوا۔ انہوں نے دریافت کیا کہ کروکشیتر میں (کنڈ) کیا چیز ہے، جواب میں یہ واضح کیا گیا کہ وہاں ایک حوض ہے جہاں کفار ہر شہر سے جمع ہو کر آتے ہیں، غسل کرتے ہیں اور دوسری مذہبی رسوم انجام دیتے ہیں۔ مولانا عبداللہ نے مزید دریافت کیا کہ یہ رسم کب سے جاری ہے جواب ملا کہ یہ قدیم رسم ہے۔ انہوں نے ساری تفصیلات معلوم کرنے کے بعد یہ فتویٰ دیا کہ کسی قدیم بت خانہ کو مسمار کرنا جائز نہیں (بت خانہ قدیم را ویران ساختن جائز نیست) شہزادہ غصہ سے بپھر گیا اور کہا کہ آپ کفار کی طرف داری کرتے ہیں پہلے آپ کو تہ تیغ کروں گا بعد میں کروکشیتر کو تباہ و برباد کروں گا۔ مولانا نے شہزادہ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ موت برحق ہے اللہ کی مرضی کے بغیر کوئی موت سے دوچار نہیں ہوتا۔ آپ نے ایک مسئلہ دریافت کیا تھا میں نے شریعت کی رو سے اس کی وضاحت کر دی، اگر شریعت کا پاس و لحاظ نہیں تو پوچھنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ سن کر سکندر کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا، اس فیصلہ سے رضامندی ظاہر کی اور مجلس برخاست ہونے کے بعد مولانا سے درخواست کی کہ کبھی کبھار شرف ملاقات سے نوازا کریں۔[۲۲]

ان مسائل سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ سلاطین دہلی فقہی مسائل میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ مختلف معاملات میں شریعت کا نقطہ نظر جاننے کے خواہش مند رہتے۔ اس کے لیے علماء سے انفرادی استفسار کے علاوہ ان کی مخصوص مجالس کا اہتمام کرتے۔ فقہی مسائل میں سلاطین کی یہ دلچسپی لازمی طور پر فقہ اسلامی کے فروغ کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہوئی۔ فقہ کے ماہرین کو سلاطین کی قربت نصیب ہوئی۔ حکوت کے زیر سرپرستی انہیں اپنی فقہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کاوشوں کو نہ صرف جاری رکھنے بلکہ آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ صوفیوں کے حلقے بھی فقہی ماحول کے اس غلبہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ ان کی مجالس میں فقہی مسائل کے چرچے ہوتے، ہدایہ کو ازبر کرنے والے (شیخ حسام الدین ملتانی) اور ابو حنیفہ ثانی کا لقب پانے والے (شیخ نصیر الدین چراغ دہلی) اسی حلقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ فقہ کے میدان میں سرگرمی کا یہ ماحول خاص طور سے چودہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا جو تغلق سلاطین کا عہدِ حکومت ہے۔ اسے فقہ کے عروج کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہندوستان میں مسلم حکومت کے قیام کے ساتھ ہی دیگر علوم کے ساتھ علم فقہ کی بھی داغ بیل پڑی۔ فقہ کی تدریس، فقہی مسائل پر اظہار خیال اور فقہی کتب کی تالیف کا سلسلہ اسی زمانہ سے شروع ہو چکا تھا لیکن اس علم کی مقبولیت اور اس کی ترویج و اشاعت کے اعتبار سے تغلق سلاطین کا دور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ علماء و فقہاء کی کاوشوں کے علاوہ سلاطین کی ذاتی دلچسپیوں کا بھی اس میں کافی دخل ہے جیسا کہ ذیل کی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

سلطان غیاث الدین تغلق کو فقہ کے ماہرین (قاضی، مفتی، محتسب وغیرہ) سے کافی انسیت تھی وہ انہیں بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا اور ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ فقہی مسائل کے حل اور احکام شریعت کی تحقیق میں ان سے کافی مدد ملتی تھی۔[۲۳] سلطان محمد بن تغلق عقلیت پسندی اور فلسفیانہ مزاج کے لیے زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں بعض عرب مورخینِ نے یہ ذکر کیا ہے کہ انہیں ''ہدایہ'' زبانی یاد تھی۔[۲۴] سلطان نے بعض دیگر ممالک سے ماہرین فقہ کو ہندوستان بلانے اور فقہ کی مشہور کتابوں کی فراہمی میں خصوصی دلچسپی لی۔ سمرقند کے مشہور عالم برہان الدین ساغر جی اور شیراز کے مایہ ناز فقیہ قاضی مجد الدین کو دہلی بلانے کے لیے اپنے مخصوص سفراء روانہ کیے اور ان علماء کے اخراجاتِ سفر کے لیے خطیر رقمیں بھی ارسال کیں۔[۲۵] اس عہد میں فقہ کے میدان میں سرگرمی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عرب مورخ القلقشندی نے اس سلطان کے زمانہ کے مدارس کے ذکر میں یہ وضاحت ضروری سمجھی کہ دہلی میں ہزار مدارس ہیں۔ ایک کے علاوہ باقی تمام میں فقہ حنفی کی تعلیم دی جاتی ہے۔[۲۶] صاحب مسالک الابصار کے بیان کے مطابق سلطان محمد بن تغلق نے درس و تدریس کے لیے ہزاروں فقہاء مقرر کیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنہیں سرکاری خزانہ سے مشاہرہ ملتا تھا۔[۲۷] یہ ذکر پہلے گزر چکا ہے کہ سلطان کے دسترخوان پر روزانہ تقریباً دو سو فقہاء موجود رہتے تھے۔

تغلق سلاطین میں فیروز شاہ تغلق فقہ میں دلچسپی اور فقہی علوم کی اشاعت کے لیے سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ سلطان کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ بہت وسیع تھا اور اس کی معارف پروری عام تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس نے علم فقہ کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی اور یہی علم اس کی توجہ کا خاص مرکز بنا۔ اسے ذاتی طور پر فقہ سے رغبت تھی اور فقہی مسائل کو جاننے و سمجھنے کا اسے کافی شوق تھا۔ سیرت فیروز شاہی کے بیان کے مطابق سلطان فقہ کی کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا اور اس طرح بہت سے مسائل میں چاروں فقہی مذاہب کے نقطہ نظر سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔[۲۸] سلطان مذہبی رجحانات کے حامل تھے اور حکومت کے مختلف شعبوں میں احکام شرعی کے نفاذ کے نہ صرف خواہشمند تھے بلکہ اس کے لیے سنجیدہ کوششیں بھی کیں۔ فقہ اسلامی کی ترویج و اشاعت میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ دراصل انہی کوششوں کا ایک حصہ تھا، سلطان یہ چاہتے تھے کہ اس علم کے ماہرین کثرت سے پیدا ہوں، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور علمی مجالس کے ذریعہ اس کی خوب اشاعت کی جائے۔ اس کے ساتھ انہوں نے یہ بھی اہتمام کیا کہ عوام و اہل حکومت دونوں کو فقہی مسائل سے واقف کرایا جائے۔ ان سب کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ عہد فیروز شاہی میں مدارس و تعلیم کے انفرادی مراکز میں فقہ کی تدریس پر خاص زور دیا گیا۔ درباری محفلوں اور علماء کی مجلسوں میں فقہ کے مسائل کثرت سے زیر بحث آئے اور اہم مسائل میں غور و فکر کے لیے مذاکرہ و مباحثہ کی روایتوں کو مزید فروغ ملا۔ اسی کے ساتھ فقہی موضوعات پر تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں میں بھی کافی اضافہ ہوا۔

۱۳۸۸ء میں فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد دہلی سلطنت کافی عرصہ تک انتشار و افتراق کا شکار رہی، حصول اقتدار کے لیے خانہ جنگی کی وجہ سے عدم استحکام کی کیفیت چھائی رہی۔ انہی حالات میں ۱۳۹۸ء میں امیر تیمور کے حملہ نے حالات اور زیادہ خراب کر دیے۔ اس سے علمی و تمدنی سرگرمیاں بھی متاثر ہوئیں۔ تغلق سلطنت کے خاتمہ کے بعد تختِ دہلی پر یکے بعد دیگرے سید و لودھی خاندان کے حکمران متمکن رہے۔ ان کے زمانہ حکومت میں علمی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرگرمیاں پھر جاری ہوئیں۔ خاص طور سے سلطان سکندر لودھی کا عہد (۱۴۸۸-۱۵۱۷ء) علوم و فنون کی اشاعت کے لیے معروف ہے۔ سلطان ذاتی طور پر علم و فن کا شایق تھا اور دیگر علوم کے ساتھ فقہ میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اہم مسائل پر فقہی نقطہ نظر سے غور و فکر کے لیے علماء کی میٹنگ منعقد کرانا اور بعض اوقات خود اس میں شریک ہوتا تھا۔[۲۹] یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ دہلی سلطنت کے زوال کے زمانہ میں جونپور میں شرقی سلطنت کے نام سے ایک خود مختار ریاست وجود میں آئی۔ اس دور میں جونپور علم و فن کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے ابھرا اور اس میدان میں اس نے اتنی ترقی کی کہ شیراز ہند کہلایا۔ شرقی سلاطین میں بالخصوص ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱-۱۴۴۰ء) علم و فن کا دلدادہ اور اہلِ علم کا قدردان تھا۔ اس نے فقہ اسلامی کے فروغ میں بھی دلچسپی لی۔ بعض اہم فقہی کتب اس کے عہد کی یادگار ہیں۔[۳۰]

فقہ اسلامی میں سلاطین دہلی کی دلچسپیاں اس کی تعلیم کے انتظام، اہم مسائل پر مباحثہ و مذاکرہ کے اہتمام اور علماء سے تبادلہ خیال تک محدود نہیں تھیں بلکہ اس موضوع پر کتابوں کی تیاری بالخصوص فتاویٰ کے مجموعوں کی تدوین و ترتیب پر بھی انھوں نے توجہ صرف کی۔ سلاطین نے عام طور پر اس میدان میں تصنیفی و تالیفی کارنامے انجام دینے والوں کی سرپرستی کی اور بعض نے خود اپنی نگرانی میں فقہ کے مبسوط مجموعے تیار کرائے جن کی اہمیت و افادیت آج بھی مسلم ہے۔ درحقیقت ہندوستان میں فقہی تصنیف و تالیف کا سلسلہ مسلم حکومت کے اولین دور سے شروع ہوا اور اگر یہ صحیح مان لیا جائے کہ سلطان محمود غزنوی کی ایما پر "مجموع سلطانی" کے نام سے فقہ کی ایک کتاب مرتب کی گئی تھی[۳۱] یا خود سلطان سے ایک فقہی تالیف (کتاب التفرید) کا انتساب تسلیم کر لیا جائے[۳۲] تو فقہی تالیفات کی ابتداء غزنوی دور سے منسوب کی جا سکتی ہے۔ عہد سلطنت کے علماء نے فقہ کی مروجہ درسی کتب (مختصر القدوری، ہدایہ، وقایہ، کنزالدقائق، المنار وغیرہا) کی شرح لکھنے کے علاوہ مختلف نوع کی فقہی کتب عربی و فارسی میں مرتب کیں ان میں خاص طور سے قابل ذکر یہ ہیں:

مطالب المومنین (بدر بن تاج لاہوری)، فقہ مخدومی (مخدوم علی مہائمی)، طرفۃ الفقہاء (رکن الدین ملتانی)، فوائد فیروز شاہی (شرف بن محمد العطائی)، تیسیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الاحکام (قاضی شہاب الدین دولت آبادی)، عدۃ الناسک فی المناسک (عمر بن اسحاق غزنوی)، کتاب الفرائض (رضی الدین حسن بن محمد صغانی)، نصاب الاحتساب (قاضی ضیاء الدین مستامی)، زبدۃ الاحکام فی اختلاف ائمۃ الاعلام (رضی الدین حسن بن محمد صغانی)، خزانۃ الروایات (قاضی جکن حنفی گجراتی)، الفائق واصول فقہ) (صفی الدین محمد بن عبدالرحیم الشافعی)۔

اہم و دلچسپ بات یہ ہے کہ سلاطین کی ایما پر فقہ کی جو کتابیں مرتب ہوئیں یا ان کے نام معنون کی گئیں وہ زیادہ تر فتاویٰ کے مجموعے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ فقہ کے معروف مسائل سے متعلق علماء و فقہاء کی آراء اور مفتیوں کے فتاوی کو جمع کر کے موضوعات کے لحاظ سے انہیں مرتب کرنا فقہ کے میدان میں تالیف کا ایک مقبول طریقہ تھا جو چوتھی صدی ہجری سے رائج ہوا۔ فقہی مسائل سے واقفیت کے لیے فتاوی کے یہ مجموعے بڑے کارآمد ثابت ہوئے تھے۔ اہلِ علم کے لیے ان سے استفادہ آسان تھا۔ خاص طور سے قاضیوں و مفتیوں کے لیے یہ بہت مفید سمجھے جاتے تھے۔ فتاوی کے ان مجموعوں کو اور زیادہ اہمیت دی جاتی جن میں عصری مسائل کی عکاسی ہوتی۔[۴۳] ہندوستانی علماء و سلاطین نے نہ صرف یہ کہ اس طریقہ تالیف کو اپنے یہاں رائج کیا بلکہ اسے مزید ترقی تک پہونچایا۔ اس ترقی کا ایک اہم پہلو منتخب علماء کے بورڈ کے توسط سے فتاویٰ کی تالیف کا انجام پانا تھا، یہ روایت عہد سلطنت میں قائم ہوئی جو بعد کے زمانہ میں اور مستحکم ہوئی۔ اس دور میں علماء و سلاطین کے تعاون سے فتاویٰ کے جو اہم مجموعے تیار ہوئے ان میں فتاویٰ غیاثیہ، فتاویٰ فیروز شاہی، فتاویٰ تاتار خانی اور فتاویٰ ابراہیم شاہی خاص طور پر ذکر کیے جا سکتے ہیں۔

فتاویٰ غیاثیہ عہد سلطنت کا اولین عربی مجموعہ فتاویٰ ہے جسے داؤد بن یوسف الخطیب نے مرتب کیا تھا۔ اس کی تالیف سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) کے عہد میں انجام پائی۔ بعض جدید مصنفین نے اسے سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد سے منسوب کیا ہے۔[۴۳-الف] جو صحیح نہیں ہے۔ گرچہ یہ فتاویٰ سلطان بلبن کی ایما پر مرتب نہیں کیا گیا لیکن مرتب نے واضح طور پر اسی سلطان کے نام اس کا انتساب کیا ہے۔ فتاویٰ کے مقدمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں اس کی خوب تعریف کی گئی ہے اور اس کے لیے مولیٰ ملوک العرب و العجم، ظہیر الانام، مغیث الاسلام والمسلمین، ظل اللہ فی العالمین ناشر الوری و الرأفۃ، الجناح الایمن للخلافۃ جیسے القاب استعمال کیے گئے ہیں۔(۳۴) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولف فتاویٰ کو سلطان کی پوری پوری سرپرستی حاصل تھی۔ اس فتاویٰ کے مخطوطات آصفیہ لائبریری (حیدر آباد) دارالمصنفین (اعظم گڑھ) اور پنجاب یونیورسٹی لائبریری (لاہور) میں محفوظ ہیں۔(۳۵) یہ بولاق، مصر سے ۱۹۰۹ء میں شایع بھی ہو چکا ہے۔ اس کے مآخذ میں فقہ حنفی کی مشہور کتابیں اور پہلے مرتب کیے گئے فتاویٰ شامل ہیں۔ مثلاً فتاویٰ ذخیرہ، فتاویٰ سمرقندی، جامع الفتاویٰ، مختصر الطحاوی، الھدایہ، ادب القاضی۔ مولفِ فتاویٰ نے فقہ کے معروف مسائل سے بحث کرنے کے علاوہ بہت سے ایسے مسائل کی وضاحت کی ہے جو اس دور میں کافی اہمیت رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر چند مسائل کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے:

نماز میں فارسی و ترکی زبان میں قراءت،(۳۶) نکاح و طلاق کے لیے فارسی الفاظ کا استعمال،(۳۷) بیت المال میں سلاطین و ان کے اہل و عیال کے حقوق،(۳۸) تسلیم و تعظیم کے طور پر سلطان کے سامنے سرنگوں ہونا،(۳۹) دینی تعلیم کے لیے معاوضہ لینا،(۴۰) بددیانت افسران کو سزا دینے کی نوعیت،(۴۱) مسلم و غیر مسلم تعلقات،(۴۲) مسلم و غیر مسلم میں مالی معاملات کے حدود،(۴۳) نفاذ جزیہ کے لیے ذمیوں کی معاشی حیثیت کی تعیین میں مقامی حالات کی رعایت وغیرہا۔(۴۴) اس فقہی تالیف کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بعد میں مرتب کیے گئے متعدد فتاویٰ: فتاویٰ تاتارخانیہ، فتاویٰ فیروز شاہی، فتاویٰ عالمگیری، فتاویٰ حمادیہ میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔

فتاویٰ فیروز شاہی عہد سلطنت کے اہم فقہی کارناموں میں شامل ہے۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے جیسا کہ پہلے واضح کیا گیا، احکامِ شریعت کی ترویج میں خاص دلچسپی لی وہ فقہ کی ایسی جامع کتاب کی تالیف کا خواہشمند تھا جو زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مسائل کی وضاحت پر حاوی ہو اور عوام و خواص یا اہل حکومت و رعایا سب کے لیے مفید ثابت ہو۔ سلطان کو اپنے ایک قریبی درباری مصاحب ملک قبول قرآن خواں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ مولانا صدر الدین یعقوب مظفر کہرامی نے فتاویٰ کا ایک مجموعہ تیار کیا تھا لیکن اس کی تصحیح و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تنقیح سے قبل مولف وفات پا گئے اور اس کا مسودہ ان کے ورثہ کے قبضہ میں غیر معروف حالت میں پڑا ہوا ہے۔ سلطان فیروز شاہ کی ایما پر اسے حاصل کیا گیا اور خود اس نے ذاتی دلچسپی سے اس کی تصحیح و تنقیح کا اہتمام فرمایا۔ قرین قیاس یہی ہے کہ یہ کام علماء کے بورڈ کے ذریعہ انجام پایا ہوگا۔ مقدمہ میں سلطان کے اوصاف و کمالات میں اس کی دین داری، پاسداری شریعت، علم نوازی، انصاف پسندی اور رعایا پروری کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس فتاویٰ کے اولین مولف کس سلطان کے عہد سے تعلق رکھتے تھے معاصر مآخذ میں اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ بہرحال فتاویٰ کا یہ مجموعہ متعدد خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ استفتاء و فتویٰ کے پیرایہ میں مرتب کیا گیا ہے جو فتاویٰ کی تالیف کا اصل طریقہ ہے۔ زبان کے لحاظ سے بھی یہ مجموعہ منفرد ہے۔ سوال و جواب فارسی میں مندرج ہیں جبکہ فتوی یا جواب کی تائید میں اقتباسات عربی کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں۔ جہاں تک اس کے مآخذ کا تعلق ہے مرتب کے بیان کے مطابق اس کی تدوین میں فقہ کی ۸۹ مستند کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔(۴۵) ان میں دوسری صدی ہجری سے چھٹی صدی ہجری تک کے فقہاء حنفیہ کی معروف کتابیں شامل ہیں۔ ان میں خاص طور سے فتاویٰ کے یہ قدیم مجموعے قابل ذکر ہیں: فتاویٰ صغریٰ، خلاصۃ الفتاویٰ، فتاویٰ سراجیہ، ذخیرۃ الفتاویٰ، فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ ظہیریہ۔ فتاویٰ فیروز شاہی ابھی غیر مطبوعہ ہے۔ اس کے مخطوطات مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہیں۔ انڈیا آفس کا مخطوطہ فقہ فیروز شاہی کے نام سے موسوم ہے۔(۴۶)

فتاویٰ فیروز شاہی میں مباحث کی ترتیب فقہ حنفی کی متداول کتابوں کے طرز پر ہے۔ اس میں معروف مسائل کے ساتھ جزئی مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے اور ان سب سے اہم یہ کہ اس میں بہت سے ایسے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں جو اس دور کے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات کے ساتھ مخصوص تھے۔ بالفاظ دیگر اس میں عصری مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ اس نوع کے مسائل میں چند قابل ذکر یہ ہیں:

-- دولت آباد میں رویت ہلال کا اہل دہلی پر اطلاق صحیح ہوگا کہ نہیں۔(۴۷)

-- دوسرے مقام سے منتقل ہوکر دہلی میں سکونت اختیار کرنے والوں کے لیے ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصل وطن کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟(۴۸)

-- ذمیوں کے ساتھ تعلقات و معاملات کی نوعیت کیا ہوگی اور انہیں کس حد تک سماجی و مذہبی حقوق حاصل ہیں۔(۴۹)

-- کون سے محاصل شرعی ہیں اور کون سے غیر شرعی؟(۵۰)

-- حکومت کو اشیاء تجارت کی قیمت کی تعیین کا اختیار حاصل ہے کہ نہیں؟(۵۱)

-- ہنڈی کا استعمال جائز ہے کہ ناجائز؟(۵۲)

-- چوگان و شطرنج کھیلنا شرعاً درست ہے کہ نہیں؟(۵۳)

-- پیشہ ورانہ گداگری اور تعویذ و گنڈے کے استعمال کی شرعی حیثیت کیا ہے؟(۵۴)

-- خراج کی ادائیگی میں غیر معمولی تاخیر کی صورت میں کیا بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ صاحب زمین کے غلہ کو تا وقت ادائیگی سرکاری تحویل میں لے لے؟(۵۵)

-- امام یا سلطان کی اطاعت کے حدود کیا ہیں؟ کن حالات میں اس کے خلاف بغاوت جائز ہے؟(۵۶)

فتاویٰ تاتار خانی عہد فیروزشاہی کی دوسری مایۂ ناز فقہی تالیف ہے جو عہد تغلق کے ایک بااثر امیر اور علم دولت عہدہ دار خان اعظم تاتار خاں (م۱۳۹۷ء) کی ایما پر انجام پائی، اس کی حیثیت ایک فقہی انسائیکلو پیڈیا کی ہے جو تیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اسے علماء کی ایک کمیٹی نے مرتب کیا تھا جس کے سربراہ عہد فیروز شاہی کے معروف فقیہ عالم بن العلاء اِلْھِی تھے۔(۵۷) تاتار خان کی یہ خواہش تھی کہ ایسا مجموعہ تیار کیا جائے جس میں مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے جائیں اور ان تمام مسائل میں جن میں فقہاء کا اختلاف پایا جاتا ہے ان کی آراء کو مآخذ کے حوالہ کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ اسی مقصد سے امیر موصوف نے فتاویٰ کے ان تمام قدیم مجموعوں کی فراہمی کا اہتمام کیا جو اس وقت دہلی میں دستیاب تھے۔ تاکہ مرتبین ان کی مدد سے زیر بحث مسائل میں فقہاء کے نقطہ نظر سے واقف ہوسکیں۔(۵۸)

فتاویٰ تاتار خانی کے مآخذ کی فہرست پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت دہلی میں فقہی کتب کثیر تعداد میں دستیاب تھیں۔ اس سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ عہد سلطنت کے علماء و حکمرانوں نے فقہ کے میدان میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ اس فتاویٰ کے مخطوطات ہندو بیرون ہند کی متعدد لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔[۵۹] اس کی پانچ جلدیں (مرتبہ قاضی سجاد حسین") حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کے زیرِ اہتمام دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے شائع ہو چکی ہیں۔

اس فتاویٰ میں ابواب وفصول کے تحت فقہی مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور ہر باب کے تحت جزئیات کا بھی استقصاء کیا گیا ہے۔ مزید براں مرتبین نے مآخذ کے حوالہ سے اختلافی آراء کو نقل کرنے کا بخوبی اہتمام کیا ہے۔ فتاویٰ کے شروع میں استفتاء و فتویٰ کے اصول و آداب سے بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جو مستفتی و مفتی دونوں کے لیے کافی اہمیت کی حامل ہے۔[۶۰] فتاویٰ کے مشتملات کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں عصری مسائل سے بھی تعرض کیا گیا ہے مثلاً کشتی پر سفر کے دوران یا کسی جانور کی سواری کرتے ہوئے نماز کی ادائیگی کا طریقہ،[۶۱] خط کے ذریعہ نکاح کا انعقاد،[۶۲] نکاح و طلاق کے لیے مروجہ کلمات کی فارسی میں ادائیگی،[۶۳] نفقہ کے اہتمام میں بیوی کی سماجی حیثیت کی رعایت،[۶۴] اہل ذمہ سے ازدواجی تعلقات،[۶۵] زوجین میں سے کسی ایک یا دونوں کے تبدیلی مذہب کی صورت میں نکاح و تفریق کے مسائل،[۶۶] مسلم اولاد پر اپنے غیر مسلم بوڑھے والدین کا نفقہ،[۶۷] متوفی کافر کا سرپرست مسلم ہونے کی صورت میں تجہیز و تکفین سے متعلق اس کی ذمہ داراياں،[۶۸] غیر مسلم ملازمین کی جانب سے صدقہ فطر کی ادائیگی۔[۶۹]

فتاویٰ تاتار خانی کی اہمیت و مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں اس کی تالیف عمل میں آئی اور نویں صدی ہجری میں یہ عرب دنیا میں متعارف ہوگیا[۷۰] اور دسویں صدی ہجری کے ایک شامی عالم ابراہیم بن محمد الحلبی نے اس کی تلخیص تیار کی۔[۷۱] ہندوستان یا دوسرے ملکوں میں تالیف کی گئی فقہ کی متعدد کتابوں میں فتاویٰ تاتار خانی کے حوالے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر البحر الرائق، الدرالمختار، فتاویٰ حمادیہ، فتاویٰ نقشبندیہ، اور فتاویٰ عالمگیری کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا جونپور کے شرقی سلاطین بھی علم نوازی، معارف پروری اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہلِ علم کی سرپرستی کے لیے معروف رہے ہیں ان میں خاص طور سے سلطان ابراہیم شاہ شرقی (۱۴۰۱-۱۴۴۰ء) اس حیثیت سے زیادہ مختار تھے۔ ان کے دور میں بعض اہم فقہی کتب مرتب ہوئیں جن میں سب سے زیادہ مشہور فتاویٰ ابراہیم شاہی ہے۔ اسے قاضی نظام الدین احمد بن محمد گیلانی جونپوری (م۱۴۶۹ء) نے سلطان کے لیے مرتب کیا تھا۔(۷۲)

فتاویٰ ابراہیم شاہی ابھی غیر مطبوعہ ہے اور اس کے مخطوطات پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور، ریاست رامپور لائبریری، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، آصفیہ لائبریری، حیدر آباد میں محفوظ ہیں۔ خدا بخش لائبریری (قدیم بانکی پور لائبریری) کے فہرست نگار نے اس کی تالیف سلطان ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری (۱۵۳۵-۱۵۶۷ء) کے زمانہ سے منسوب کی ہے جو صحیح نہیں ہے۔(۷۳) یہ فتاویٰ دو بڑے حصوں پر مشتمل ہے اور دلچسپ بات یہ کہ پہلا حصہ جو عبادات سے متعلق ہے فارسی میں ہے اور دوسرا حصہ جو معاملات سے تعلق رکھتا ہے عربی میں ہے۔ اس فتاویٰ کے مآخذ میں قرآن و حدیث کے علاوہ فقہ کی سینکڑوں کتابیں شامل ہیں۔ خود مولف کے بیان کے مطابق اس کی تالیف میں ۱۶۰ فقہی کتب سے مدد لی گئی ہے۔(۷۴)

مختلف ابواب کے تحت فقہ کے معروف مسائل بیان کرتے ہوئے مولف نے بعض اہم و دلچسپ نکات واضح کیے ہیں۔ مثلاً حج کے باب میں انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ایک بار حج کر چکا ہے اور دوسری بار حج کرنے کا خواہشمند ہے تو اس کے لیے افضل یہ ہے کہ جتنی رقم حج میں خرچ ہونے والی ہو اسی کے بقدر وہ مستحق لوگوں پر صدقہ کر دے۔(۷۵) ہدایہ و تحائف کی تقسیم سے بحث کرتے ہوئے مولف نے اس پر خاص زور دیا ہے کہ پڑوسیوں و محلہ والوں کو اس میں شریک کیا جائے تاکہ بھائی چارگی کا ماحول پروان چڑھے اور آپس میں تعلقات مضبوط ہوں۔(۷۶) عادل و منصف حکمراں کی تعریف بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس سے مراد وہ حکمران ہے جس کی حکومت کے تحت حاکم و محکوم اور غلام و آزاد کے مابین بحیثیت رعایا کوئی فرق نہ ہو، کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی روا نہ ہو اور ظالم کو سزا دینے میں کوئی رعایت نہ کی جائے۔ اہم بات یہ کہ ان سب کے ساتھ یہ بھی صراحت کی گئی ہے کہ اشیاء صرف کی قیمتیں غیرمتوازن نہ ہوں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک ہی چیز دو قیمتوں پر نہ فروخت کی جائیں۔(۷۷) مزید براں مولف نے ظالم سلطان کے خلاف بڑا سخت موقف اختیار کیا ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ کسی بھی صورت میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے اس لیے کہ اس سے ظلم کو تقویت ملے گی اس سے آگے بڑھ کر صاحب فتاویٰ نے یہ رائے بھی پیش کی ہے کہ ظالم حکمراں کو عادل کے لفظ سے یاد کرنا کفر کے مترادف ہے۔(۷۸)

عہدِ سلطنت کی فقہی تالیفات کے باب میں ان تفصیلات سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ سلاطینِ دہلی کی معارف پروری بالخصوص فقہ اسلامی میں ان کی دلچسپی فقہ کی کتنی اہم کتب بالخصوص فتاویٰ کے بیش بہا مجموعوں کی تالیف کا سبب بنی۔ ان میں بعض ایسی کتابیں شامل ہیں جنھیں بجا طور پر فقہی دائرۃ المعارف کہا جا سکتا ہے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ عہد سلطنت کے ہندوستان میں فقہ حنفی کو غلبہ حاصل رہا اور اسی مسلک کو سرکاری سرپرستی نصیب ہوئی،(۷۹) اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلم حکومت کے قیام کے بعد وسط ایشیا کے مختلف حصوں سے جو علماء ہندوستان آئے وہ زیادہ تر حنفی تھے۔ ان کے زیرِ اثر اس سرزمین میں فقہ حنفی کو رواج ملا۔ ان کی تعلیم و تربیت سے جو ہندوستانی علماء و فضلاء تیار ہوئے وہ فقہ حنفی کے ترجمان بن کر نکلے۔ دوسری جانب وہ لوگ جن کے ہاتھوں دہلی سلطنت کی بنیاد پڑی اور جو ایک طویل عرصہ تک حکمران رہے وہ بھی حنفی مسلک کے پیرو تھے۔ معاصر علماء (بالخصوص دربار سے تعلق رکھنے والے) فقہ حنفی سے ان کا تعلق مضبوط کرنے میں مزید معاون ثابت ہوئے۔ ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے حکمرانوں نے سرکاری طور پر فقہ حنفی کو مقبولیت عطا کی اور اس کی ترویج و اشاعت میں بھرپور دلچسپی لی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگرانی میں فقہ کی جو کتابیں مرتب ہوئیں ان میں خاص طور سے حنفی مسلک کی ترجمانی ملتی ہے۔ حکومت کے زیرِ اہتمام جو مدارس قائم ہوئے ان میں فقہ حنفی کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا۔ جو علماء سلاطین سے قریب رہے اور جنھیں حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ان میں اکثریت حنفی علماء کی تھی۔ ان سب کے ساتھ اصل بات جس کی جانب یہاں توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ یہ سلاطین حنفی مسلک کی اتباع میں متشدد نہیں تھے اور نہ ہی دوسرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذاہب فقہ کے تئیں ان میں تنگ نظری پائی جاتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی ایما پر جو فقہی کتب تالیف کی گئیں ان میں حنفی مسلک کی ترجمانی ملتی ہے اور اس کے تئیں ترجیحی رویہ نظر آتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ کتابیں غیر حنفی فقہاء کے موقف کی وضاحت سے یکسر خالی ہیں بلکہ اہم و اختلافی مسائل میں ان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ خاص طور سے فتاویٰ تاتار خانی میں اس کی مثالیں بہ کثرت دستیاب ہیں۔

دوسرے عہد سلطنت میں شیخ الاسلام و قاضی کے منصب پر بعض ایسے علماء کو مامور کیا گیا جو مالکی یا شافعی مسلک کے ترجمان تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اودھ کے شیخ الاسلام کی حیثیت سے مولانا فرید الدین کو مقرر کیا تھا جو ایک شافعی عالم تھے۔(۸۰) اسی طرح محمد بن تغلق نے مشہور سیاح ابن بطوطہ کو دارالسلطنت میں قضا کا عہدہ تفویض کیا تھا اور یہ بخوبی معلوم ہے کہ وہ مالکی تھے۔(۸۱) مزید براں اس کے بھی شواہد دستیاب ہیں کہ سلاطین بعض اوقات درپیش مسائل میں فیصلہ لیتے ہوئے کسی مصلحت کے تحت حنفی کے بجائے دیگر مسلک کے فقہاء کا موقف اختیار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر فیروز شاہ تغلق نے برہمنوں پر جزیہ عاید کرتے ہوئے سب پر اس کی یکساں مقدار (فی نفر دس تنکہ) مقرر کی تھی۔(۸۲) جبکہ حنفی مسلک کی رو سے ذمیوں کو تین طبقوں امیر، متوسط و ادنیٰ میں تقسیم کر کے ان میں سے ہر طبقہ کے لوگوں پر جزیہ کی مختلف مقدار عاید کی جاتی ہے۔(۸۳) فیروز شاہ کا یہ اقدام واضح طور پر شافعی و مالکی فقہاء کے نقطۂ نظر کے مطابق تھا جو جزیہ کے مقدار کی تعیین میں آمدنی کے اعتبار سے ذمیوں کی طبقاتی تقسیم ضروری نہیں سمجھتے۔(۸۴)

اوپر کے مباحث سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ سلاطینِ دہلی نے فقہ اسلامی میں کافی دلچسپی ظاہر کی، ماہرین فقہ کی سرپرستی فرمائی اور فقہی کتب کے مرتبین کو خصوصی انعام و اکرام سے نوازا، درپیش مسائل میں شریعت کا حکم جاننے و سمجھنے کے لیے انہوں نے مختلف طریقے اختیار کیے۔ علماء سے انفرادی طور پر استفسار سلاطین کا معمول تھا۔ اہم و اختلافی مسائل میں ان کی اجتماعی رائے معلوم کرنے کے لیے مذاکرہ و مباحثہ کی روایت کو بھی انہوں نے فروغ دیا۔ ان سب پر مزید یہ کہ بعض سلاطین و امراء نے خود اپنی نگرانی میں فتاویٰ کے مبسوط مجموعے مرتب کرائے۔ بلاشبہ سلاطین کی فقہی دلچسپیوں نے اس وقت کے پورے علمی ماحول

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کو متاثر کیا۔ اس میدان میں علماء و فقہاء کی سرگرمیوں میں اور اضافہ ہوا اور معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت سے متعلق مختلف امور میں شریعت کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی طلب عوام و خواص دونوں میں بڑھ گئی جو یقینی طور پر فقہی قوانین کی ترویج و فقہ اسلامی کے فروغ کا باعث بنی۔

حواشی و مراجع

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں عبدالسلام ندوی، تاریخ فقہ اسلامی (اردو ترجمہ تاریخ التشریع الاسلامی از محمد الخضری) دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۷۳ء۔

MUHAMMAD HAMIDULLAH KHAN, THE SCHOOLS OF ISLAMIC JURISPRUDENCE, KITAB BHAWAN, NEWDELHI, 1991.

۲۔ منہاج السراج، طبقات ناصری (تصحیح عبدالحئی حبیبی)، کابل ۱۹۶۴ء، ص ۱۶۶، عصامی، فتوح السلاطین، مدراس، ۱۹۴۸ء، ص ۱۱۴-۱۱۵، ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۶۲ء، ۲۴۱، ۳۵۲، ۳۵۴، ابن بطوطہ، رحلہ ابن بطوطہ۔ دار صادر، بیروت، ۱۹۶۴ء، ص ۴۱۴-۴۱۵

۳۔ ابوالعباس القلقشندی، صبح الاعشیٰ، مطبعہ امیریہ، القاہرہ، ۱۹۱۵ء، ۹۵/۵۔

۴۔ رزق اللہ مشتاقی، واقعات مشتاقی، روٹوگراف، نمبر۳ (مخطوطہ برٹش میوزیم) ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اوراق ۲۶ الف، ۲۶ ب۔

۵۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۹۰-۲۹۶

۶۔ حوالہ مذکور، ص ۲۹۲

۷۔ حوالہ مذکور، ص ۵۱۰-۵۱۱

۸۔ حوالہ مذکور، ص ۵۴۸

۹۔ عصامی، ص ۱۱۸-۱۱۹

۱۰۔ شیخ جمالی، سیر العارفین، دہلی، ۱۳۱۱ھ، ص ۱۶۵-۱۶۸

۱۱۔ یحیٰی بن احمد السہرندی، تاریخ مبارک شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ص ۶۵-۶۷، عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، دہلی، ۱۳۳۲ھ، ص ۷۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۱۲۔ محمد مبارک کرمانی، سیر الاولیاء، موسسہ انتشارات اسلامی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۵۳۷، ۵۳۹

۱۳۔ شمس سراج عفیف، تاریخ فیروز شاہی، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، ص ۱۲۱-۱۲۲، نظام الدین احمد بخشی، طبقات اکبری، کلکتہ، ۱۹۲۷ء، ۲۲۶/۱-۲۲۷

۱۴۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۵-۳۸۲

۱۵۔ حوالہ مذکور، ص ۳۸۲-۳۸۴

۱۶۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۱۲۹-۱۳۰

۱۷۔ فتوحات فیروز شاہی، (مرتبہ شیخ عبدالرشید)، علی گڑھ، ۱۹۵۴ء، ص ۷-۹

۱۸۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۷۹-۳۸۲

۱۹۔ فتوحات فیروز شاہی، ص ۷-۹

۲۰۔ فتوحات فیروز شاہی، ص ۷

۲۱۔ عبداللہ داؤدی، تاریخ داؤدی (تصحیح شیخ عبدالرشید)، علی گڑھ (بدون تاریخ)، ص ۵۹-۶۰، نظام الدین احمد بخشی، محولہ بالا، ص ۱۶۳-۱۶۴

۲۲۔ عبداللہ داؤدی، ص ۲۹-۳۰، احمد یادگار، تاریخ شاہی، کلکتہ، ۱۹۳۹ء، ص ۳۰-۳۱

۲۳۔ برنی، تاریخ فیروز شاہی، ص ۴۴۱

۲۴۔ شہاب الدین العمری، مسالک الابصار۔ (عربی متن مع اردو ترجمہ در: خورشید احمد فارق، تاریخ ہند پر ایک نئی روشنی۔ عربی کی ایک خطی کتاب سے) ندوۃ المصنفین، دہلی (بدون تاریخ) ص ۳۸

۲۵۔ ابن بطوطہ، ص ۴۵۶-۴۵۷، عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۴

۲۶۔ القلقشندی، ۶۹/۵

۲۷۔ شہاب الدین العمری، ص ۴۱

۲۸۔ سیرت فیروز شاہی، نقل (مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)، یونیورسٹی کلکشن مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، نمبر۱۱۱، ص ۲۹۰-۲۹۱

۲۹۔ نورالحق دہلوی، زبدۃ التواریخ، روٹو گراف، نمبر۱۸ (مخطوطہ برٹش میوزیم)، ریسرچ لائبریری، شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ورق ۴۲ ب

۳۰۔ **Mian Mhuammad Saeed The Sharqi Sultanate of Jounpur,**

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

Karachi, 1972, pp.53-54, 181-183

۳۱۔ ''مجموع سلطانی'' کے مخطوطات مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ (سبحان اللہ کلکشن)، اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ (فہرست مرتبہ ریونو نمبر ۲۵۹) میں دستیاب ہیں۔

۳۲۔ عبدالحیٔ الحسنی، نزہۃ الخواطر، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۴۷ء، ۹۵/۱

۳۳۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں تدوین فتاویٰ کے آغاز و ارتقاء پر تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں میرا انگریزی مقالہ Origin and Development of Fatawa-Compiletion in Medieval India, Hamdard ISLamicus (Karachi), 20/1, Jan-March, 1997, pp. 7-18

۳۳(الف) الفتاویٰ التاتار خانیہ، (تصحیح و تدوین قاضی سجاد حسین)، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، ۴۰/۱ (مقدمہ)

۳۴۔ داؤد بن یوسف الخطیب الفتاویٰ الغیاثیہ، بولاق، مصر، ۱۹۰۹ء، (مقدمہ)

۳۵۔ فہرست کتب عربی فارسی اور اردو، کتب خانہ آصفیہ، حیدر آباد، ۱۳۳۳ھ، ۱۱۱/۲، فہرست مفصل پنجاب یونیورسٹی لائبریری (عربی مخطوطات)، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۸-۱۳۹

۳۶۔ الفتاویٰ الغیاثیہ، ص ۲۷-۲۸

۳۷۔ حوالہ مذکور، ص ۵۹، ۶۳، ۶۵، ۷۱، ۷۲

۳۸۔ حوالہ مذکور، ص ۴۹

۳۹۔ حوالہ مذکور، ص ۱۰۷

۴۰۔ حوالہ مذکور، ص ۱۰۸

۴۱۔ حوالہ مذکور، ص ۴۷

۴۲۔ حوالہ مذکور، ص ۱۰۲، ۱۰۳

۴۳۔ حوالہ مذکور، ص ۱۲۶

۴۴۔ حوالہ مذکور، ص ۴۸

۴۵۔ فتاویٰ فیروز شاہی، مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری، یونیورسٹی کلکشن، نمبر ۲۶۰ (دیباچہ) اوراق ۱ الف، ۲ ب

۴۶۔ فہرست مخطوطات فارسی انڈیا آفس لائبریری، لندن (مرتبہ ایتھے) ۱۹۰۳ء، ۱۳۷۷/۱ء، نمبر ۲۵۶۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۷۔ فتاویٰ فیروز شاہی، ورق ۸۸ ب

۴۸۔ حوالہ مذکور، ورق ۶۹ ب

۴۹۔ حوالہ مذکور، اوراق ۷۶ الف، ۷۶ ب، ۲۱۴ الف، ۲۱۹ ب، ۲۵۰ ب، ۳۳۶ الف، ۳۳۶ ب، ۴۸۴ الف، ۴۸۷ ب، ۵۰۸ الف، ۵۰۹ ب

۵۰۔ حوالہ مذکور، اوراق ۲۴۸ الف، ۲۴۹ الف

۵۱۔ حوالہ مذکور، ورق ۷۱ الف

۵۲۔ حوالہ مذکور، اوراق ۳۰۹ ب، ۳۱۰ الف، ۴۰۲ب

۵۳۔ حوالہ مذکور، اوراق ۳۴۲ الف، ۳۴۳ ب، ۳۴۶ ب، ۳۴۶ الف-۳۴۷ الف

۵۴۔ حوالہ مذکور، ورق ۴۸۰ ب

۵۵۔ حوالہ مذکور، ورق ۷۵ الف

۵۶۔ حوالہ مذکور، اوراق ۲۰۹ ب-۲۱۰ الف

۵۷۔ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ کریں: عفیف، ص ۳۹۱-۳۹۲، محمد غوثی شطاری، گلزار ابرار (اردو ترجمہ)، لاہور، ۱۳۹۵ھ، ص ۴۹۲-۴۹۳۔ عبدالحیٔ الحسن، نزہۃ الخواطر دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۴۷ء، ۲/۶۷، عبدالاولی، مفید المغنی، آسی پریس لکھنؤ، ۱۳۲۶ھ، ص۱۰۲

۵۸۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۳۹۲، فتاویٰ تاتار خانی کے بارے میں مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے: ریاست علی ندوی، کچھ فتاویٰ تاتار خانی کے بارے میں، معارف ۵۹/۳، مارچ ۱۹۴۷ء، ص ۱۶۵-۱۸۰

۵۹۔ محمد اسحاق بھٹی، برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱۵-۱۱۶، الفتاویٰ تاتار خانیہ، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد، ۱۹۸۴ء، ۱/۳۴-۳۵

۶۰۔ الفتاویٰ التاتار خانیہ، ۱/۸۰-۸۶

۶۱۔ حوالہ مذکور، ۱/۸۳-۸۴، ۲/۴۴-۴۵

۶۲۔ حوالہ مذکور، ۲/۵۴

۶۳۔ حوالہ مذکور، ۲/۵۸، ۳/۳۲۳

۶۴۔ حوالہ مذکور، ۳/۲۸۳

۶۵۔ حوالہ مذکور، ۳/۱۷۱-۱۷۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۶۶۔ حوالہ مذکور، ۱۷۳/۳-۱۷۵، ۱۸۱-۱۸۲

۶۷۔ حوالہ مذکور، ۲۵۸/۴

۶۸۔ حوالہ مذکور، ۱۷۳/۲

۶۹۔ حوالہ مذکور، ۳۲۱/۲

۷۰۔ کتب خانہ خدیویہ، مصر میں اس فتاویٰ کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے جس کا سنِ کتابت ۸۶۲ھ ہے۔

۷۱۔ خلیفہ چلپی، کشف الظنون، القاہرہ، ۱۳۶۰ھ، ۲۶۸/۱، مفید المفتی، ص ۱۰۲

۷۲۔ نزہۃ الخواطر، ۲۲/۳

۷۳۔ فہرست مخطوطات عربی و فارسی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۴ء، جلد نمبر ۳۳، ص ۴۰

۷۴۔ حوالہ مذکور

۷۵۔ محمد اسحاق بھٹی، برصغیر پاک و ہند میں علم فقہ، ص ۱۷۶

۷۶۔ حوالہ مذکور، ص ۱۸۷

۷۷۔ حوالہ مذکور، ص ۱۷۷-۱۷۸، ۱۹۱-۱۹۲

۷۸۔ حوالہ مذکور، ص ۱۷۸

۷۹۔ امیر خسرو، دول رانی خضر خاں، علی گڑھ، ۱۹۱۷ء، ص ۴۶-۴۷، برنی، ص ۲۹۰، القلقشندی ۶۹/۵، شہاب الدین العمری، ص ۲۳، عبدالحئی الحسنی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، دمشق، ۱۹۵۸ء، ص ۱۹۲-۱۹۳

۸۰۔ سیر الاولیاء، ص ۲۸۵

۸۱۔ ابن بطوطہ، ص ۵۱۲-۵۱۳

۸۲۔ عفیف، تاریخ فیروز شاہی، ص ۲۸۴

۸۳۔ برہان الدین علی المرغینانی، الہدایہ، لکھنؤ، ۱۳۲۵ھ، (کتاب السیر، باب الجزیہ) ۵۷۱/۲-۵۷۲

۸۴۔ ابوالحسن علی الماوردی، الاحکام السلطانیہ، مصر، ۱۹۰۹ء، ص ۱۲۸

☆☆☆☆

© rasailojaraid.com